سلسلہ اشاعت امامیہ مشن نمبر ۱۳۲

اسلام کا نظریۂ حکومت

از

افادات حضرت سید العلماء مدظلہ

قیمت ۲ر

محصول ار

تعارف

"اسلام کا نظریہ حکومت"

کے

موضوع پر سرکار سید العلماء مدظلہ کے دس بیانات جو مدرستہ الواعظین
لکھنؤ میں ۱۳۶۶ھ میں ہوئے تھے وہ افسوس ہے کہ شارٹ ہینڈ رپورٹر
کے نہ ہونے کی وجہ سے قلمبند نہ ہو سکے تھے مگر چونکہ فی زمانہ ان کی اشاعت
کی انتہائی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اس لیے ان بیانات کا خلاصہ
ہی سردست شایع کرنے پر اکتفا کی جارہی ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو انشاءاللہ
آیندہ اس موضوع پر ایک بسیط کتاب بھی شائع کر دی جائے گی۔ اگرچہ
ایک اعتبار سے یہ بھی مکمل ہے کیونکہ اس میں بھی جملہ ضروری اجزاء آگئے
ہیں یعنی خاکہ مکمل ہے صرف توضیحات و امثال کی ضرورت ہے

اُمید کہ افراد ملت اس رسالہ کی اشاعت کی جانب بھی خاص
توجہ فرمائیں گے۔

خادم ملت
سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین
وآلہ الطاہرین

تمہید

حکومت کی ضرورت

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوع انسان کے لئے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق انسان آزادی کا تخیل انسان کے لیے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں مگر انسان کا آزادی مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اُس کا فطری حق ہے بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ "ناجائز قیود سے آزادی"

اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اُس کے لئے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں۔ حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفر ہی نہیں

ان ہی اجتماعی قیود کا نام "دستور العمل اور قانون" ہے اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔

ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساس فرض رکھتے ہوں تو اُن کے لئے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لئے صرف احساس فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ اُن سب کا نقطۂ نظر مفاد اجتماعی بس ایک ہی نقطہ تک پہونچے اور کوئی دانستہ یا نادانستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہونچائے اور یہ اُسی وقت ہوسکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل تمام منزلوں میں یکساں درجہ پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا خیالی دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بیگانہ ہے اس لئے اس صورت پر بحث ہی کرنا بیکار ہے،

جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظام اجتماعی یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے یہ بھی کچھ حدود و حقوق اور اُن کی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اُس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو اُن حدود کا پابند بنائے آپ حاکم نہ کہئے گھر کا بڑا کہہ لیجئے۔

مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہونچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں چاہے جتنا بھی اختلاف کیا جائے مگر اس کی ضرورت میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اقسام حکومت

ارسطو نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں

(۱) ایک شخص کی حکومت

(۲) تھوڑے محدود ومعین افراد کی حکومت

(۳) بہت سے افراد کی حکومت

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سے اب تک دو ہزار برس گزرنے کے باوجود دنیا طرح طرح کے تمدنی انقلابات اور نظریات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرہ سے باہر نہیں نکلی ہے مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی حکومت، اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایک شخص میں آخر امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان اس کے محکوم ہوں۔ اس کے لئے قدیم زمانہ میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم پیدائشی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک نوع ممتاز ہے ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہوگئے ہیں اور کبھی کبھی آخر میں مقید رہے ہیں۔ بلکہ گدائی پر مجبور ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں مستولی ہوتی ہے۔ اور اسی لئے جب وہ تخیل ختم ہو جاتا ہے تو وہ بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اگر ان کا امتیاز کوئی پیدائشی حق ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا۔ نہ اس میں انقلاب ہوتا۔ پھر جب ہم تاریخ کا تبصرہ شاہان سلف پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر بہت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی پست تھے۔ چونکہ مورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے اس لئے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا۔ یا جاہل تھا۔ یا بے رحم تھا۔ یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے وہ طاقت و اقتدار ہے
اُسی کو دوسری لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں قہر و غلبہ کا ذریعہ حکومت ہونا
تسلیم ہے مگر معیارِ حقانیت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔
مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے، بالکل ٹھیک مگر قائم ہونا چاہیے
بھی۔ ایسا نہیں ہے۔

بہت سی باتیں ہو جایا کرتی ہیں مگر اُن کا ہو جانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔
مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر والے بے خبر سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے
کہ چور آئیں اور سب مال لے جائیں مگر اُن کا یہ مال و اسباب لیجانا جائز بھی ہو یعنی وہ مجرم نہ
قرار پائیں ایسا نہیں۔

اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا
تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے اُن کے مکان یا اسباب پر
قبضہ کر لیں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال و اسباب یا جائداد اُن کی ملک بھی ہو جائے
بلکہ دنیا کا ہر قانون اُن ڈاکوؤں کو سزا دینے اور اُن سے اس مال کے برآمد کرنے کے لئے
تیار ہوگا پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ ملکیت قائم نہیں کر سکتا تو ایک ملک یا قوم پر یہ قہر
و غلبہ تسلط کو جائز کیونکر قرار دے سکتا ہے۔

پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کرکے
اس کی مخالفت کرے تو اُسے کیونکر جرم سمجھا جا سکتا ہے۔

اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لئے دوسرے انسانوں
پر کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔

دوسری قسم یعنی چند انسانوں کی حکومت اس کے بارے میں بھی وہی سوال ہے
یعنی ان چند آدمیوں کو حق حکومت کیونکر حاصل ہوا۔ اور جس طرح ایک شخص کی حکومت
کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی اسی طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلا وجہ ہے۔

تیسری قسم یعنی بہت سے آدمیوں کی حکومت اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ
بہت سے آدمی تمام قوم کا جزو ہیں یا کل قوم ہیں اگر جزو ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب
ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو باقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفاد حکومت ختم حکومت کی ضرورت تو اس لئے بھی کہ ان افراد میں جو خود غرض مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جبکہ قانون سازی خود اُس جماعت کا کام ہوگیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا جس وقت چاہے گی ویسا قانون بنائے گی چاہے وہ صحیح ہو چاہے غلط۔ اور اس کے نتیجہ میں مختلف جماعتوں اور مختلف افراد میں رسہ کشی ہوتی رہے گی۔ یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے۔ اور اُس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اُس کے مقصد کو نقصان پہونچتا ہو۔

پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لئے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کئے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو دوسری بار کے انتخاب میں اُن کے ہاتھ سے اختیارات لے لیے جائیں گے۔ اور دوسروں کے سپرد کیے جائیں گے۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ ووٹ یعنی انتخابی رائیں مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں وہ اُن سے کرا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افراد قوم پر مسلط کرتے ہیں اور اُن کے احساسات بے ہوشی سنگھا دیتے ہیں یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلۂ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت وہی مخذول و منکوب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان بھی صحت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند اشخاص کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فولادی ہتھیاروں سے حاصل کیا جائے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو دماغ کو متاثر کر دیں کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادی خیالات کو محصور کر دے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معاہدۂ عمرانی اور اس پر بحث

ایک نظریہ جسے "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے مفاد اجتماعی کی خاطر۔ اس طرح یہ پابندی اس کے لئے بار خاطر نہ ہوگی کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتدا میں یہ معاہدہ دل کی خوشی سے ہے اور اسی لئے وہ حق آزادی کے خلاف نہیں، اسی طرح کیا بعد میں اس معاہدہ پر باقی رہنا امر اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا خود ہی اس معاہدہ کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدہ پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی حالانکہ اس نظریہ کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔

پھر یہ کہ جب افراد جامعہ خود غرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفاد شخصی کو پیش نظر نہ رکھیں اور صرف مفاد اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے جو قانون بنے وہ مفاد عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کیں اُن میں سے کوئی بھی کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں

اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے؟ یہاں پر بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ حکومت یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں اُن کا نظام۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ جمہوری اصول پر تھیں مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان تمام حکومتوں میں شخصی فرمانروائی تھی جس کا اصول بھی ایک نہ تھا بلکہ کبھی ایک جلسہ میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق کے حاکم نے اپنے بعد والے کو نامزد کر دیا اور کبھی اس نے ایک کمیٹی مشورہ کے لیے بنا دی اور کبھی ابھر کر صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا جیسا ہوتا گیا ویسے ہی اصول بنتے گئے یعنی اجماع، استخلاف۔ شوریٰ۔ قہر و غلبہ

اب مختصر طور پر ان چاروں اصول پر تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"اجماع" اس سے مراد تمام رقبہ مملکت کے افراد کا اتفاق ہے یا صرف دار السلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا وہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی بعض کا جو متفق ہو گئے ہوں۔

اگر کل افراد حدود مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانہ برق و بخار میں، زمانہ سیارہ و طیارہ میں بھی مہینوں کا کام ہے چہ جائیکہ اس زمانہ میں جبکہ یہ وسائل مخابرت نہ تھے۔ اس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائے کہ اس سے کم یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ۔

پھر عقلی طور پر وہ کتنے ہی کثیر افراد ہوں ان میں سے سب کے فیصلہ کا درست ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی ایک غیر جائز الخطا یعنی معصوم مانا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہو وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اور اگر صرف دار السلطنت کے کل افراد، تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ باقی اطراف مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں چون و چرا کا کوئی حق نہیں۔ اور اس سب سے بھی بڑھ کر یہ کہ دار السلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش و اختلاف کے ساتھ جس میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔ پھر جبکہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو اور اس کے لیے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جا سکتا ہے نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبر کی حدیث۔ آیت یہ
ہے کہ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ و یتبع غیر سبیل
المومنین نولہ ما تولیٰ و نصلہ جھنم وساءت مصیرا اس میں صرف آخری
فقرہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ
جہنمی ہے۔ "مگر مومنین پر تو الف لام استغراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں اس سے یہ
نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ جتنے بھی مومن جس جگہ جمع ہو کر کوئی فیصلہ کر لیں وہ صحیح ہوگا۔ پھر یہ
پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسول سے جھگڑا
کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے یہ جہنم میں جائے گا اور اس سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ رسول سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے راستے کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمان کے
منافی ہے۔ اس سے تو نتیجہ اس کے خلاف نکلتا ہے یعنی یہ کہ پیغمبر کے مقابلہ میں اُمت کو لب کشائی
کا حق نہیں ہے۔

حدیث لا تجتمع امتی علی ضلالۃ (یا) علی خطاء یعنی پیغمبر کا ارشاد ہے کہ میری
اُمت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیثیں سند کے
اعتبار سے بالکل درست ہوں تب بھی اس میں تمام اُمت کے اجماع کا ذکر ہے۔
چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز مذکور نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اجماع جو معیار
حکومت قرار دیا گیا ہے اُس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔
رہ گیا استخلاف تو ظاہر ہے کہ اُس کی بنیاد ہے اُس حکمران کے حق حکومت پر جو دنیا سے
جا رہا ہے اور جبکہ اُسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو استخلاف کا کیا حق اس سے
قائم ہوگا۔

اس کے بعد شوریٰ وہ ساختہ و پرداختہ اُس حاکم کا ہے جو باستخلاف معین ہوا تھا اور
جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کی نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے محل پر ثابت نہیں ہے
چوتھی چیز قہر و غلبہ، یہ وہی طاقت حق والا نظریہ ہے جس کو پہلے غلط ثابت کیا جا چکا ہے
اگر قہر و غلبہ ہی معیار صحت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس سے
یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شرعی اور جائز حکومتیں ہیں
اس لئے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تنہا غلبہ ...

اقتدار کو وجہ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کافر سے اتنا شدید نقصان نہیں پہونچ سکتا جتنا دشمن زیر آستین پنہاں کیے ہوئے کافر یعنی منافق سے

اسلام کا نظریۂ حکومت

اب دوبارہ پھر یہ بحث آگئی ہے کہ خود اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے؟ یہ پہلے بیان ہو چکا کہ حکومت کے دو کام ہیں ایک دستور و قانون کی تشکیل - دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجرا و نفاذ۔

اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر "اسلام" نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو دماغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اُسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی تو بے شک یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کریں لیکن اسلام تو خود ایک دستور حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں بلکہ زندگی کے لیے عملی ضوابط و قواعد ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کرنے کے ساتھ ہی یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی و اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے۔ پھر خود قانون سازی کرے۔ یا کسی دوسرے شخص کے لئے قانون سازی کے حق کا قائل ہو۔ یا پوری قوم مجتمعہ طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو۔ یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانون اسلام کے سپرد کر چکا ہے۔

موجودہ زمانہ کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اُس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لئے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہو سکے اس لئے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لئے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے۔ مگر یہ تو اُس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شروع ہی سے ملک یا اقلیم کے لئے ہو لیکن اگر قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر ہو یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون نوع انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو یعنی خالق عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے۔ یہی اسلام کا نظریۂ حکومت ہے۔

یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے۔ ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اُس کی اور صرف اُس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد کسی مجلس یا کسی قوم کی حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد ارسطو کی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط چند آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔

اس کا نتیجہ ہے آزادی کامل یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یوں کیوں کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دباؤ فطرت کے قیود سے باہر ہے۔ رہ گیا خالق اُس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔

اگر آزادی افعال میں کجروی نہ کرے گا تو اضطراری اور فطری افعال میں جبر کرے ہی گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ لہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرھاً مگر انسان کا شرف انسانی اس کا مقتضی ہے کہ وہ اس اطاعت کو با اختیار کرے تاکہ اُس کی حق شناسی کا ثبوت ہے۔ بے شک چونکہ اُس کے قانون کے معلوم کرنے کے لئے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہونچ کر ہم سے بات کرے اس لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے یہ رسول ہے مگر اس کا کام احکام الٰہی کا پہونچانا ہے۔

نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے اور نہ اُس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اُس کی زبان پر آتے ہیں وہ احکام الٰہی ہیں۔

(وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ) اور جو اس کی اطاعت ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے (ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ) اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حق حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایان شان نہیں ہے۔

قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ (وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم) "کسی مومن یا مومنہ کو اللہ اور رسول کے حکم کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا"

دوسری جگہ زیادہ واضح کلیہ کی شکل میں اعلان کیا ہے (وربک یخلق ما یشاء و یختار ما کان لھم الخیرة) "پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے"

انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے"

اس کے علاوہ سنت الٰہیہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے یہاں تک
کہ اس کی طرف کا حکمراں خود اپنے لیے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں
کرتا بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہے (واشرکہ فی امری) اور محدود مقصد یعنی دشمن کے مقابلہ کیلئے
ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ "ملک" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قوم خود نہ مقرر
کر سکی، بلکہ نبی سے خواہش کی ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ اور نبی نے بھی خود نہ مقرر
کیا بلکہ یہ کہا کہ ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا "اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر
کیا ہے" پھر قوم نے اس کے استحقاق پر اعتراض کیا، وہ اعتراض اور قوم کا حق مداخلت بھی قبول
نہ کیا گیا بلکہ اس ذیل میں ایک کلیہ کا اعلان کر دیا گیا کہ واللہ یؤتی ملکہ من یشاء "اللہ
اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے" اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حاکم حقیقی اللہ ہے تو اللہ ہی نائب کو
مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی رہنما بن سکتا ہے۔

مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب کر کے اپنے ذمے لے کر جو انقلاب
اٹھایا اس معنی کہ اگر وہ اصول مقرر رہتا تو پھر "من و تو" کا سوال پیدا ہو کر انتشار نہ پیدا کرتا
دیکھ لیجئے کہ رسول کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسول
ہو جاتے۔ قبلہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہو جاتے اور کتاب کو اللہ
کی جانب سے مانا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہو جاتے۔ اختلاف بھی اسی وقت سے پیدا ہوا
جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھوں میں لے لیا بس اس کے بعد سے
مسلمانوں کے شیرازہ میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔

پیغمبر کا اعلان و عمل دونوں اس بارے میں متحد رہے کہ حاکم کے تقرر میں رعایا کو اختیار
نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت
میں میرا حصہ قرار دے دیجئے تو حضرت نے جواب میں صاف فرما دیا کہ اس کا مجھے اختیار
یہ تو اللہ سے متعلق ہے۔ اب جو حضرت نے بیعت عشیرہ میں حضرت علی ابن ابیطالب کے حق
میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر، وصی اور خلیفہ ہے تو بحیثیت مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرت
کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف کا اعلان ہے۔ اور اس
سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے۔ ورنہ رسول

اپنے ذمہ نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبہ میں پیغمبر نے ولایت علیؑ کے اعلان کے قبل پہلے مسلمانوں سے اصول
تسلیم کرالیا اس استفہام کے ساتھ کہ الست اولیٰ بکم من انفسکم قالوا بلیٰ کیا میں تم سب سے زیادہ
اختیار نہیں رکھتا ہوں سب نے کہا بیشک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ اب اس کو تسلیم کرلینے کے بعد تو
مسلمانوں کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ کبھی صحیح قرار ہی نہیں پا سکتا۔ اور
اسی لئے رسول کی زندگی میں یہ صدا کسی ذہن سے بھی نکلتے نہیں سنائی دیتی کہ حکومت ہمارا حق ہے
یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے۔ ہاں رسول جب دنیا سے اُٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ اور قہر
وغلبہ کا نام بھی سنائی دینے لگا۔ مگر یہ مسلمانوں کے خود ساختہ اصول ہیں۔ ان کا اسلام سے
قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

عرصہ تک حکومت کے یہ اصول جمہور مسلمین میں تسلیم کیے جاتے رہے۔ اور عام نظریہ یہی
قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو
کسی کو مخالفت کا حق نہیں اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تادیبی مہم جاری
کرے۔ تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اُس کے خلاف ہو وہ مجرم اور اگر اس سلسلہ میں
قتل ہو جائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا۔ شہید اُسے نہیں کہا جا سکتا۔
یہی اب تک عملدرآمد رہا تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں امیر شام معاویہ نے
اب فرزند یزید کے لئے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک بلکہ ان تمام طریقوں کو
جمع کر دیا۔ انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں خود جا کر جلسے کیے اور یزید
کی بیعت لی۔ اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا ایسا اس کے پہلے کسی خلیفہ
کا نہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ استخلاف بھی تھا اور قہر و غلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے
کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہیے۔ اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اُس کے خلاف
کاروائی کا حق اور وہ اگر قتل ہو جائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔
مگر حسینؑ ابن علیؑ کا یہ کارنامہ تھا کہ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اس بادشاہ کے مقابلہ
میں اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنا دیا کہ
دنیا حسینؑ کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسینؑ اور ان کے ساتھی سب شہید
ہو گئے اور یزید ہمیشہ کے لئے مردود و ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسینؑ نے اُس
حکومت کا تختہ الٹ دیا جو اسلامی نظریہ کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا نظریۂ حکومت مادی اسباب یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب یا حصول تاج و تخت کا محتاج ہے مگر اسلامی نظریۂ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو مخالفت پر کمر بستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو، گوشہ نشینی و کس مپرسی ہو، پیوند دار لباس اور فرش حصیر ہو لیکن اگر وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف کار اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ "الٰہی حاکم ہے" اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومت الٰہیہ کے ماننے والے ہیں وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے اور جو بھی دنیا کا حاکم اپنے مادی اقتدار کی بنا پر تسلط قائم کرے گا اسے ہمیشہ غاصب سمجھیں چاہے وہ حکمراں ظاہری طور پر اپنے کو مسلمان بلکہ اس سے بھی بڑھکر اس فرقہ کا پیرو بتا ہو جس میں حکومت الٰہیہ کے نظام کو تسلیم کیا جاتا ہے یاد رکھنا چاہیئے کہ حکومت الٰہیہ کا ایک پیرو کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظام اقتدار کے شکنجہ میں اسیر بھی ہوگا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اس کی نسبت کیا ہے اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظت جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکم الٰہی یہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانون سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومت وقت کے احکام کی اطاعت ہے مگر حقیقت میں حاکم اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے اتفاق سے نتیجہ اس کا حاکم وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہوگیا ہے لیکن اگر اپنے حاکم اللہ کا یہ منشا دیکھے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ دنیا گوارا کرے گا گھر کا برباد ہونا قبول کرلے گا مگر جہاد کے لیے کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی روح کبھی غلام نہیں بنائی جاسکتی۔

حکومت الٰہیہ کے قیام کی دشواری

یہ تو حکومت الٰہیہ کی اصل حقیقت جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کارفرما ہے لیکن جہاں تک اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے وہ افراد عالم کے وجود پر موقوف ہے۔ اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوئے تو وہ نائب موجود ہوگا جسے خصوصیت کے ساتھ بذریعہ پیغمبر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا اس

تسلیم نہ کرے گی اور اُسے گوشہ نشین ہو جانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶۰ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربہ کے لیے کافی ہے کہ افراد صالحہ کا فقدان حکومت الٰہیہ کے ظاہری طور پر برسر اقتدار آنے میں مانع ہے لہٰذا اگر اس کے بعد نائب خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو اس کا سبب افراد کی عدم صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمران غائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو۔ یقیناً اگر اس وقت افراد صالحہ پیدا ہو جائیں تو حاکم حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کر دے۔

جبکہ ایسا نہیں ہے تو موجودہ حالات میں حکومت الٰہیہ کے برسر اقتدار آنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

یوں نظری حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت یہ حق حکام شرع یعنی علمائے دین کا ہے مگر موجودہ مادی رجحانات کی رو میں ہمیں یقین ہے کہ اگر اس طرح کی تشکیل کا ارادہ کیا جائے تو خود اُس طبقہ میں جو منصب حکومت کا اہل سمجھا جائے بہت سے افراد برسر اقتدار آنے کی کوشش کریں گے جو شاید اس کے اہل نہوں اور اُن افراد کو گوشہ نشین رہنا پڑے گا جو اس کے واقعاً اہل قرار پا سکتے ہوں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نتیجہ میں وہ حکومت بھی حکومت الٰہیہ نہ ہوگی چاہے وہ حکومت شرع کے نام سے قائم کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ افراد صالحہ ہمارے علم میں نایاب ہیں اور ہوں تو یقیناً گوشہ ہائے گمنامی میں ہیں جن کا تعارف بھی دُنیا کو نہیں ہے ایسی صورت میں یہ یقین سمجھنا چاہیے کہ جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ "غیر الٰہیہ" ہی ہوگی۔ چاہے وہ غیروں کی ہو اور چاہے اپنوں کی ہو لیکن حکومت الٰہیہ کے علاوہ کسی اقتدار، کسی تنظیم، کسی ادارہ سے غیر مشروط معاہدہ تعاون یا بیعت کسی طرح جائز نہیں جبکہ اللہ کے نظام عمل یا معاہدہ کیے ہوئے ہیں کہ ہمیں اُس کے احکام پر عمل کرنا ہے تو کسی جماعت کے نظام عمل کو ہم غیر مقید طریقہ پر کیسے قبول کر سکتے ہیں جبکہ یہ ممکن ہے کہ اُس نظام عمل میں ایسی صورتیں پیدا ہوں کہ ہمیں حکومت الٰہیہ کے احکام کی تعمیل میں اُس کی مخالفت لازم ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ہر حکومت کے ساتھ امن عام کی خاطر تعاون کرنا لازم ہے مگر آزاد رہ کر یعنی خود اپنے فرض کے احساس سے صحیح طریقہ عمل کو معلوم کر کے۔

لیکن کسی جماعت کے طریقہ کا پابند ہو کر عمل کرنا یہ حکومت الٰہیہ کی پابندی کے منافی اور ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کے خلاف ہے۔ والسلام۔

پبلشر
سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری
امامیہ مشن لکھنؤ

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ